تقریر

تقریر بابت مسیح موعودؑ
وقت 5-7منٹ

# حضرت مسیح موعودؑ کی احباب جماعت کو نصائح

(ملفوظات جلد 3 ایڈیشن 1984ء)

(تقریر نمبر 5)

اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے:

اِنَّا لَنَنۡصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَیَوۡمَ یَقُوۡمُ الۡاَشۡہَادُ (المومن:52)

ہم یقیناً اپنے رسولوں کی اور اُن کی جو ایمان لائے اِس دنیا کی زندگی میں بھی مدد کریں گے اور اُس دن بھی جب گواہ کھڑے ہوں گے۔

کرتا ہے معجزوں سے وہ یارِ دین کو تازہ
اسلام کے چمن کی بادِ صبا یہی ہے

**سامعین کرام!** حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے بیان فرمودہ ملفوظات کی دس جلدوں میں ذاتی اصلاح اور احبابِ جماعت کی تعلیم و تربیت و اصلاحِ احوال کے متعلق بہت قیمتی نصائح ملتی ہیں۔ آج سے ملفوظات جلد سوم کے ایڈیشن 1984ء سے چند اہم اور قیمتی نصائح آپ احباب کے سامنے پیش کرنے جا رہا ہوں۔ آج کی تقریر ملفوظات جلد سوم میں بیان نصائح کی پانچویں تقریر ہے۔

**سامعین! قرآن شریف کی جامع و مانع تعلیمات**

حضورؑ اِس سلسلہ میں فرماتے ہیں:

"اب اس تعلیم پر نگاہ کرو کہ نہ یہ توریت کی طرح محض انتقام پر ہی زور دیتی ہے اور نہ انجیل کی طرح ایسے عفو پر جو بسا اوقات خطرناک نتائج کا موجب ہو سکتی ہے بلکہ قرآن شریف کی تعلیم حکیمانہ نظام اپنے اندر رکھتی ہے۔ مثلاً ایک خدمتگار ہے جو بڑا شریف اور نیک چلن ہے کبھی اس نے خیانت نہیں کی اور کوئی نقصان نہیں کیا۔ اگر اتفاقاً وہ چائے پلانے کے لئے آئے اور اس کے ہاتھ سے پیالیاں گر کر ٹوٹ جاویں۔ تو اُس وقت مقتضائے وقت کیا ہو گا کیا یہ کہ اس کو سزا دیں یا معاف کر دیں۔ ایسی حالت میں ایسے شریف خدمتگار کو معاف کر دینا اُس کے واسطے کافی سزا ہو گی۔ لیکن اگر ایک شریر خدمتگار جو ہر روز کوئی نہ کوئی نقصان کرتا ہے۔ اس کو معاف کر دینا اور بھی دلیر کر دینا ہے۔ اس لئے اس کو سزا دینی ضرور ہو گی مگر انجیل یہ نہیں بتاتی۔ انجیل پر عمل کر کے تو گورنمنٹ کو چاہئے کہ اگر کوئی ہندوستان مانگے۔ تو وہ انگلستان بھی اُس کے حوالے کرے۔ کیا عملی طور پر انجیل مانی جاتی ہے۔ ہرگز نہیں۔ گورنمنٹ کے سیاست مدن کے اصولوں پر مختلف محکموں کا قائم کرنا اور عدالتوں کا کھولنا دشمن سے حفاظت کے لئے فوجوں کا رکھنا وغیرہ وغیرہ جس قدر اُمور ہیں۔ انجیل کی تعلیم کے موافق نہیں ہیں۔ اس لئے کہ انجیل کی تعلیم کے موافق کوئی انتظام ہو سکتا ہی نہیں ہے۔

غرض قرآن شریف کی تعلیم جس پہلو اور جس باب میں دیکھو، اپنے اندر حکیمانہ پہلو رکھتی ہے۔ افراط یا تفریط اس میں نہیں ہے۔ بلکہ وہ نقطۂ وسط پر قائم ہوئی ہے اور اسی لئے اس امت کا نام بھی اُمَّةً وَّسَطًا رکھا گیا ہے۔ یہ بات کہ انجیل یا توریت کی تعلیم کیوں اعتدال اور وسط پر واقع نہیں ہوئی۔ اس سے خدا تعالیٰ پر کوئی اعتراض نہیں آتا اور نہ اس تعلیم کو ہم خلاف آئینِ حکمت کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ حکمت کے معنی ہیں۔ وَضْعُ الشَّیءِ فِیْ مَحَلِّہٖ اس وقت کی حکمت کا تقاضا ایسی ہی تعلیم تھی جیسا کہ ہم نے بتایا ہے کہ سزا کے وقت سزا دینا بھی حکمت ہے اور عفو کے وقت عفو ہی حکمت ہے۔ اسی طرح پر اس وقت طبائع کی حالت کچھ ایسی ہی واقع ہوئی تھی کہ تعلیم کو ایک پہلو پر رکھنا پڑا۔ بنی اسرائیل چار سو برس تک فرعون کی غلامی میں رہے تھے اور اس وجہ سے ان لوگوں کے عادات اور رسوم کا ان پر بہت بڑا اثر پڑا ہوا تھا اور یہ قاعدہ کی بات ہے کہ

بادشاہ کے اطوار و عادات اور آئین ملک داری کا اثر رعایا پر پڑتا ہے۔ بلکہ اُن کے مذہب تک پر اثر جا پڑتا ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے۔ اَلنَّاسُ عَلٰی دِینِ مُلُوکِھِمْ۔ چنانچہ سکھوں کے زمانہ میں عام لوگوں پر بھی یہ اثر پڑا تھا کہ عموماً لوگ ڈاکہ زن اور دھاڑوی ہو گئے تھے۔ ہری سنگھ وغیرہ براتیں ہی لُوٹ لیا کرتے تھے۔ اسی طرح پر فرعونیوں کی غلامی میں رہ کر بنی اسرائیل عدل کو کچھ سمجھتے ہی نہیں تھے ان پر جو ہمیشہ ظلم ہوتا تھا وہ بھی اعتداءً ظلم کر بیٹھے تھے پس اُن کی اصلاح کے لئے تو پہلا مرحلہ یہی چاہئے تھا کہ ان کو عدل کی تعلیم سکھائی جاتی۔ اس لئے یہ تعلیم اُن کو دی گئی کہ آنکھ کے بدلہ آنکھ اور دانت کے بدلہ دانت۔ اس تعلیم پر وہ اس قدر پُختہ ہو گئے کہ پھر انہوں نے انتقام لینا ہی شریعت کی جان سمجھ لیا اور مذہب ہو گیا کہ اگر بدلہ نہ لیں گے تو گنہگار ٹھہریں گے۔ اس واسطے جب حضرت مسیح علیہ السلام آئے اور انہوں نے دیکھا کہ بنی اسرائیل کی حالت ایسی ہو گئی ہے تو انہوں نے حد درجہ کے عفو کی تعلیم دی کیونکہ جس قدر زور کے ساتھ وہ انتقام پر قائم ہو چکے تھے۔ اگر اس سے بڑھ کر عفو کی تعلیم نہ دی جاتی تو وہ مؤثر ثابت نہ ہوتی۔ اس لئے ان کی تعلیم کا سارا مدار اسی پر رہا۔ پس اُن اسباب اور وُجوہ کے لحاظ سے یہ دونوں تعلیمیں اگرچہ اپنی جگہ ہی حکمت ہیں۔ لیکن ان کو قانون مختصُ المقام یا قانون مختصّ الوقت کی طرح سمجھنا چاہئے۔"

(ملفوظات جلد 3 صفحہ 40-42)

## قرآن شریف ہی مستقل اور ابدی شریعت ہے

فرمایا:

"خدا تعالیٰ کی حکمتیں اور احکام دو قسم کے ہوتے ہیں۔ بعض مستقل اور دائمی ہوتے ہیں بعض آنی اور وقتی ضرورتوں کے لحاظ سے صادر ہوتے ہیں۔ اگرچہ اپنی جگہ اُن میں بھی ایک استقلال ہوتا ہے مگر وہ آنی ہی ہوتے ہیں۔ مثلاً سفر کے لئے نماز یا روزہ کے متعلق اور احکام ہوتے ہیں اور حالت قیام میں اَور۔ باہر جب عورت نکلتی ہے تو وہ بُرقع لے کر نکلتی ہے۔ گھر میں ایسی ضرورت نہیں ہوتی کہ برقع لے کر پھرتی رہے۔ اسی طرح پر توریت اور انجیل کے احکام آنی اور وقتی ضرورتوں کے موافق تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو شریعت اور کتاب لے کر آئے تھے۔ وہ کتاب مستقل اور ابدی شریعت ہے۔ اس لئے اس میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ کامل اور مکمل ہے۔ قرآن شریف قانون مُستقل ہے اور توریت انجیل اگر قرآن شریف نہ بھی آتا۔ تب بھی منسُوخ ہو جاتیں۔ کیونکہ وہ مستقل اور ابدی قانون نہ تھے۔

مَیں نے بعض احمقوں کو اعتراض کرتے سنا ہے کہ ایسا کیوں کیا گیا۔ خدا تعالیٰ نے پہلی کتابوں کو کیوں منسُوخ کیا۔ کیا اس کو علم نہ تھا۔ پہلے ہی مکمل اور مستقل ابدی شریعت بھیجنی تھی۔ یہ اعتراض بالکل نادانی کا اعتراض ہے۔ کیونکہ یہ کلیہ قاعدہ نہیں ہے کہ ہر نسخ کے لئے ضروری ہے کہ علم نہ ہو۔ اگر یہ صحیح ہے کہ ہر نسخ میں عدم عِلم ثابت ہوتا ہے۔ تو پھر اس بات کا کیا جواب ہے کہ جو کپڑے برس یا دو برس کے بچے کو پہنائے جاتے ہیں۔ کیوں وہی کپڑے پانچ دس برس یا پچیس برس کے ایک جوان کو نہیں پہنائے جاتے؟ کیا ہو سکتا ہے کہ گز آدھ گز کا کُرتہ ایک نوجوان کو پہنایا جاوے یقیناً کوئی سلیم الطّبع انسان اس بات کو پسند نہیں کرے گا۔ بلکہ وہ ایسی حرکت پر ہنسی اڑائے گا۔ اب اس مثال سے کیسی صفائی کے ساتھ ثابت ہوتا ہے کہ یہ ہر گز ضروری نہیں ہے کہ ہر نسخ کے لئے عدم عِلم ثابت ہو۔ جب ہم بجائے خود معرض تغیّر میں ہیں تو ہماری ضرورتیں اس تغیر کے ساتھ ساتھ بدلتی جاتی ہیں۔ پھر ان تبدیلیوں کے موافق جو نسخ ہوتا ہے وہ ایک عِلم و حِکمت کی بناء پر ہوا یا عدم علم پر۔ یہ اعتراض سراسر جہالت اور حُمق کا نشان ہے۔ جیسے پیدا ہونے والے بچے کے مُنہ میں روٹی کا ٹکڑہ یا گوشت کی بوٹی نہیں دے سکتے۔ اسی طرح پر ابتدائی حالت میں شریعت کے وہ اسرار نہیں مل سکتے جو اس کے کمال پر ظاہر ہوتے ہیں۔ طبیب ایک وقت خود مُسہل دیتا ہے اور دوسرے وقت جبکہ اسہال کا مرض ہو اس کو قابض دوا دیتا ہے۔ ہر حالت میں ایک ہی نسخہ وہ کیسے رکھ سکتا ہے۔

غرض قرآن شریف حکمت ہے اور مستقل شریعت ہے اور ساری تعلیموں کا مخزن ہے اور اس طرح پر قرآن شریف کا پہلا معجزہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم ہے اور پھر دوسرا معجزہ قرآن شریف کا اس کی عظیم الشان پیشگوئیاں ہیں چنانچہ سُورہ فاتحہ اور سُورہ تحریم اور سُورہ نور میں کتنی بڑی عظیم الشان پیشگوئیاں ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی ساری پیشگوئیوں سے بھری ہوئی ہے۔ اُن پر اگر ایک دانشمند آدمی خدا سے خوف کھا کر غور کرے تو اسے معلوم ہو گا کہ کس قدر غیب کی خبریں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ملی ہیں۔ کیا اس وقت جبکہ ساری قوم آپ کی مخالف تھی اور کوئی ہمدرد اور رفیق نہ تھا۔ یہ کہنا کہ سَیُھزَمُ الْجَمْعُ وَیُوَلُّونَ الدُّبُر چھوٹی بات ہو سکتی تھی۔ اسباب کے لحاظ سے تو ایسا فتویٰ دیا جاتا تھا کہ ان کا خاتمہ ہو جاوے گا۔ مگر آپ ایسی حالت میں اپنی کامیابی اور دشمنوں کی ذلّت اور نامُرادی کی پیشگوئیاں کر رہے ہیں اور آخر اسی طرح وقوع میں آتا ہے۔ پھر تیرہ سو سال کے بعد قائم ہونے والے سلسلہ کی اور اُس وقت کے آثار و علامات کی پیشگوئیاں کیسی عظیم الشان اور لا نظیر ہیں۔

دنیا کی کسی کتاب کی پیشگوئیوں کو پیش کرو۔ کیا مسیح کی پیشگوئیاں ان کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔ جہاں صرف اتنا ہی ہے کہ زلزلے آئیں گے، قحط پڑیں گے، آندھیاں آئیں گی، مُرغ بانگ دے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔"

(ملفوظات جلد 3 صفحہ 42-44)

## یہ جماعت مثیل صحابہ ہو

فرمایا:

"عقل مند کو ماننے میں کیا تامّل ہو سکتا ہے جب وہ ان تمام امور کو، جو بیان کیے جاتے ہیں، یکجائی نظر سے دیکھے گا۔ اب میرا مدّعا اور منشا اس بیان سے یہ ہے کہ جب خدا تعالیٰ نے یہ سلسلہ قائم کیا ہے اور اس کی تائید میں صدہانشان ظاہر کیے ہیں اس سے اس کی غرض یہ ہے کہ یہ جماعت **صحابہؓ کی جماعت** ہو، اور خیر القُرون کا زمانہ آجاوے۔ جو لوگ اس سلسلے میں داخل ہوں چونکہ وہ وَآخَرِيْنَ مِنْهُمْ میں داخل ہوتے ہیں، اس لیے وہ جھوٹے مشاغل کے کپڑے اُتار دیں اور اپنی ساری توجہ خدا تعالیٰ کی طرف کریں۔ فَيْجِ اَعْوَجْ (ٹیڑھی فوج) کے دشمن ہوں۔

اسلام پر تین زمانے گزرے ہیں ایک قرون ثلاثہ اس کے بعد فیج اَعْوَجْ کا زمانہ جس کی بابت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا کہ **لَيْسُوا مِنِّيْ وَلَسْتُ مِنْهُمْ** یعنی نہ وہ مجھ سے ہیں اور نہ مَیں ان سے ہوں اور تیسرا زمانہ مسیح موعود کا زمانہ ہے جو دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانہ سے ملحق ہے بلکہ حقیقت میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ ہے۔ فَيجِ اَعْوَج کا ذکر اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ بھی فرماتے تو قرآن شریف ہمارے ہاتھ میں ہے اور آخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ صاف ظاہر کرتی ہے کہ کوئی زمانہ ایسا بھی ہے جو صحابہ کے مشرب کے خلاف ہے اور واقعات بتا رہے ہیں کہ اس ہزار سال کے درمیان اسلام بہت ہی مشکلات اور مصائب کا نشانہ بنا رہا ہے۔ معدودے چند کے سوا سب نے اسلام کو چھوڑ دیا اور بہت سے فرقے معتزلہ اور اباحتی وغیرہ پیدا ہو گئے۔

ہم کو اس بات کا اعتراف ہے کہ کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا کہ اسلام کی برکات کا کوئی نمونہ موجود نہ ہو مگر وہ ابدال اور اولیاء اللہ جو اس درمیانی زمانہ میں گزرے ان کی تعداد اس قدر قلیل تھی کہ ان کروڑوں انسانوں کے مقابلہ میں جو صراطِ مستقیم سے بھٹک کر اسلام سے دور جا پڑے تھے کچھ بھی چیز نہ تھے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کی آنکھ سے اس زمانہ کو دیکھا اور اس کا نام فَيجِ اعوج رکھ دیا۔ مگر اب اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا ہے کہ وہ ایک اور گروہِ کثیر پیدا کرے جو **صحابہ کا گروہ** کہلائے مگر چونکہ خدا تعالیٰ کا قانونِ قدرت یہی ہے کہ اس کے قائم کردہ سلسلے میں تدریجی ترقی ہوا کرتی ہے، اس لیے ہماری جماعت کی ترقی بھی تدریجی اور كَزَرْعٍ (کھیتی کی طرح) ہو گی اور وہ مقاصد اور مطالب اس بیج کی طرح ہیں جو زمین میں بویا جاتا ہے۔ وہ مراتب اور مقاصدِ عالیہ جن پر اللہ تعالیٰ اس کو پہنچانا چاہتا ہے ابھی بہت دور ہیں۔ وہ حاصل نہیں ہو سکتے ہیں جب تک وہ خصوصیت پیدا نہ ہو جو اس سلسلہ کے قیام سے خدا کا منشاء ہے۔ توحید کے اقرار میں بھی خاص رنگ ہو۔ تبتّل اِلی اللہ ایک خاص رنگ کا ہو۔ ذکرِ الٰہی میں خاص رنگ ہو۔ حقوقِ اخوان میں خاص رنگ ہو۔"

(ملفوظات جلد سوم صفحہ 94-95)

## ہماری جماعت کے واعظ کیسے ہوں

**سامعین!** حضورؑ فرماتے ہیں:

"یہ امر بہت ضروری ہے کہ ہماری جماعت کے واعظ تیار ہوں۔ لیکن اگر دوسرے واعظوں اور ان میں کوئی امتیاز نہ ہو تو فضول ہے۔ یہ واعظ اس قسم کے ہونے چاہئیں جو پہلے اپنی اصلاح کریں اور اپنے چلن میں ایک پاک تبدیلی کر کے دکھائیں۔ تا کہ ان کے نیک نمونوں کا اثر دوسروں پر پڑے عملی حالت کا عمدہ ہونا یہ سب سے بہترین وعظ ہے۔ جو لوگ صرف وعظ کرتے ہیں مگر خود اس پر عمل نہیں کرتے وہ دوسروں پر کوئی اچھا اثر نہیں ڈال سکتے۔ بلکہ ان کا وعظ بعض اوقات اباحت پھیلانے والا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ سُننے والے جب دیکھتے ہیں کہ وعظ کہنے والا خود عمل نہیں کرتا تو وہ ان باتوں کو بالکل خیالی سمجھتے ہیں۔ اس لئے سب سے اول جس چیز کی ضرورت واعظ کو ہے وہ اُس کی عملی حالت ہے۔ دوسری بات جو اُن واعظوں کے لئے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ان کو صحیح علم اور واقفیت ہمارے عقائد اور مسائل کی ہو۔ جو کچھ ہم دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اس کو انہوں نے پہلے خود اچھی طرح پر سمجھ لیا ہو اور ناقص اور اُدھورا علم نہ رکھتے ہوں کہ مخالفوں کے سامنے شرمندہ ہوں اور جب کسی نے کوئی اعتراض کیا تو گھبرا گئے کہ اب اس کا کیا جواب دیں۔ غرض علم صحیح ہونا ضروری ہے اور تیسری بات یہ ہے کہ ایسی قوت اور شجاعت پیدا ہو کہ حق کے طالبوں کے واسطے

ان میں زبان اور دل ہو۔یعنی پوری دلیری اور شجاعت کے ساتھ بغیر کسی قسم کے خوف وہراس کے اظہار حق کے لئے بول سکیں اور حق گوئی کے لئے اُن کے دل پرکسی دولتمند کا تموّل یا بہادر کی شجاعت یا حاکم کی حکومت کوئی اثر پیدا نہ کر سکے۔یہ تین چیزیں جب حاصل ہو جائیں۔تب ہماری جماعت کے واعظ مفید ہو سکتے ہیں۔

یہ شجاعت اور ہمت ایک کشش پیدا کرے گی کہ جس سے دل اس سلسلہ کی طرف کھچے چلے آئیں گے۔مگر یہ کشش اور جذب دو چیزوں کو چاہتی ہے جن کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی۔اوّل پورا علم ہو۔دوم تقویٰ ہو۔کوئی علم بدُوں تقویٰ کے کام نہیں دیتا ہے اور تقویٰ بدُوں علم کے نہیں ہو سکتا۔سنّت اللہ یہی ہے جب انسان پورا علم حاصل کرتا ہے تو اسے حیااور شرم بھی دامنگیر ہو جاتی ہے۔پس ان تینوں باتوں میں ہمارے واعظ کامل ہونے چاہئیں اور یہ مَیں اس لئے چاہتا ہوں کہ اکثر ہمارے نام خطوط آتے ہیں فلاں سوال کا جواب کیا ہے؟ فلاں اعتراض کرتے ہیں اس کا کیا جواب دیں؟ اب ان خطوط کے کس قدر جواب لکھے جاویں۔اگر خود یہ لوگ علم صحیح اور پوری واقفیت حاصل کریں اور ہماری کتابوں کو غور سے پڑھیں تو وہ ان مشکلات میں نہ رہیں۔‘‘

(ملفوظات جلد 3صفحہ369۔370)

**سامعین!دشمنوں سے مجادلہ ومباحثہ نہ کریں**

فرمایا:

’’مَیں بڑی تاکید سے اپنی جماعت کو جہاں کہیں وہ ہیں منع کرتا ہوں کہ وہ کسی قسم کا مباحثہ مقابلہ اور مجادلہ نہ کریں۔اگر کہیں کسی کو کوئی درشت اور نا ملائم بات سُننے کا اتفاق ہو تو اعراض کرے۔مَیں بڑے وثوق اور سچے ایمان سے کہتا ہوں کہ مَیں دیکھ رہا ہوں کہ ہماری تائید میں آسمان پر خاص تیاری ہو رہی ہے۔ہماری طرف سے ہر پہلو کے لحاظ سے لوگوں پر حُجّت پوری ہو چکی ہے۔اس لئے اب خدا تعالیٰ نے اپنی طرف سے اُس کارروائی کے کرنے کا ارادہ فرمایا ہے جو وہ اپنی سنّت قدیم کے موافق اتمام حُجّت کے بعد کیا کرتا ہے۔مجھے خوف ہے کہ اگر ہماری جماعت کے لوگ بدزبانیوں اور فضول بحثوں سے باز نہ آئیں گے تو ایسا نہ ہو کہ آسمانی کارروائی میں کوئی تاخیر اور روک پیدا ہو جاوے۔کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عادت ہے کہ ہمیشہ اس کا عتاب ان لوگوں پر آتا ہے جن پر اس کے فضل اور عطایات بے شمار ہوں اور جنہیں وہ اپنے نشانات دکھا چکا ہوتا ہے۔وُہ ان لوگوں کی طرف کبھی متوجہ نہیں ہوتا کہ انہیں عتاب یا خطاب یا ملامت کرے جن کے خلاف اس کا آخری فیصلہ نافذ ہونا ہوتا ہے۔چنانچہ ایک طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتا ہے۔ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ اور فرماتا ہے وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ اور فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ ۔یہ حجّت آمیز عتاب اس بات پر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہت جلد فیصلہ کفّار کے حق میں چاہتے تھے۔مگر خدا تعالیٰ اپنے مصالح اور سُنن کے لحاظ سے بڑے توقّف اور حلم کے ساتھ کام کرتا ہے۔لیکن آخر کار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کو ایسا کُچلا اور پیسا کہ اُن کا نام ونشان مٹا دیا۔اسی طرح پر ممکن ہے کہ ہماری جماعت کے بعض لوگ طرح طرح کی گالیاں افترا پردازیاں اور بدزبانیاں خدا تعالیٰ کے سچے سلسلے کی نسبت سُنکر اضطراب اور استعجال میں پڑیں۔مگر انہیں خدا تعالیٰ کی اس سُنّت کو جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ برتی گئی ہمیشہ ملحوظِ خاطر رکھنا چاہئے۔اس لئے مَیں پھر اور بار بار تاکید حکم کرتا ہوں کہ جنگ وجدال کے مجمعوں، تحریکوں اور تقریبوں سے کنارہ کشی کرو۔اس لئے کہ جو کام تم کرنا چاہتے ہو۔یعنی دشمنوں پر حجّت پُوری کرنا وہ اب خدا تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔

تمہارا کام اب یہ ہونا چاہئے کہ دعاؤں اور استغفار اور عبادتِ الٰہی اور تزکیہ وتصفیۂ نفس میں مشغول ہو جاؤ۔اس طرح اپنے تئیں مستحق بناؤ خدا تعالیٰ کی ان عنایات اور توجہات کا جن کا اس نے وعدہ فرمایا ہے۔اگرچہ خدا تعالیٰ کے میرے ساتھ بڑے بڑے وعدے اور پیشگوئیاں ہیں جن کی نسبت یقین ہے کہ وہ پُوری ہوں گی۔مگر تم خواہ نخواہ اُن پر مغرور نہ ہو جاؤ۔ہر قسم کے حسد، کینہ، بغض، غیبت اور کبر اور رعونت اور فسق وفجور کی ظاہری اور باطنی راہوں اور کسل اور غفلت سے بچو اور خوب یاد رکھو کہ انجام کار ہمیشہ متقیوں کا ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ۔اس لئے متقی بننے کی فکر کرو۔

حضرت مولانا مولوی عبد الکریم صاحب نے ذکر کیا کہ حضور کی بیماری کی شدّت میں میرے دل میں بہت رقت پیدا ہوئی تو مَیں نے بہت دعا کی کہ مولا کریم اسلام کی عزت، قرآن کی عزت، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت بالآخر تیری اپنی عزت اور جلال کے اظہار کا بھی اسوقت یہی ذریعہ ہے۔تو اس پر فرمایا۔

بیماری کی شدت میں جبکہ یہ گمان ہوتا تھا کہ رُوح پرواز کر جائے گی۔مجھے بھی الہام ہوا۔اَللّٰهُمَّ اِنْ اَهلكتَ هٰذه العصابَة فلَنْ تُعْبد فِي الارضِ اَبَدًا۔یعنی اے خدا!اگر تو نے اس جماعت کو ہلاک کر دیا تو پھر اس کے بعد اس زمین میں تیری پرستش کبھی نہ ہو گی۔

فرمایا۔ یقیناً یاد رکھو۔ یہ سلسلہ اس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے قائم کیا ہے۔ اگر یہ سلسلہ قائم نہ ہوتا تو دنیا میں نصرانیت پھیل جاتی اور خدائے وحدہ لاشریک کی توحید قائم نہ رہتی۔ یا یہ مسلمان ہوتے جو اپنے ناپاک اور جھوٹے عقیدوں کے ساتھ نصرانیت کو مدد دیتے ہیں اور اُن کے معبود اور خدا بنائے ہوئے مسیح کے لئے میدان خالی کرتے ہیں۔ یہ سلسلہ اب کسی ہاتھ اور طاقت سے نابُود نہ ہوگا۔ یہ ضرور بڑھے گا اور پھُولے گا اور خدا کی بڑی بڑی برکتیں اور فضل اس پر ہوں گے۔ جب ہمیں خدا کے زندہ اور مبارک وعدہ ہر روز ملتے ہیں اور وہ تسلی دیتا ہے کہ مَیں تمہارے ساتھ ہوں اور تمہاری دعوت زمین کے کناروں تک پہنچاؤں گا۔ پھر ہم کسی کی تحقیر اور گالی گلوچ پر کیوں مضطرب ہوں۔"

(ملفوظات جلد 3 صفحہ 282-284)

## گالیوں کا جواب گالیوں سے نہ دیں

**سامعین! فرمایا:**

"یہ مجھے گالیاں دیتے ہیں لیکن مَیں ان کی گالیوں کی پرواہ نہیں کرتا اور نہ ان پر افسوس کرتا ہوں کیونکہ وہ اس مقابلہ سے عاجز آ گئے ہیں اور اپنی عاجزی اور فرومائیگی کو بجز اس کے نہیں چھپا سکتے کہ گالیاں دیں، کفر کے فتوے لگائیں، جھوٹے مقدمات بنائیں اور قسم قسم کے افترا اور بہتان لگائیں۔ وہ اپنی ساری قوتوں کو کام میں لا کر میرا مقابلہ کر لیں اور دیکھ لیں کہ آخری فیصلہ کس کے حق میں ہوتا ہے۔ مَیں اُن کی گالیوں کی اگر پرواہ کروں تو وہ اصل کام جو خدا تعالیٰ نے مجھے سپرد کیا ہے رہ جاتا ہے۔ اس لیے جہاں مَیں اُن کی گالیوں کی پرواہ نہیں کرتا مَیں اپنی جماعت کو نصیحت کرتا ہوں کہ اُن کو مناسب ہے کہ اُن کی گالیاں سن کر برداشت کریں اور ہرگز ہرگز گالی کا جواب گالی سے نہ دیں کیونکہ اس طرح پر برکت جاتی رہتی ہے۔ وہ صبر اور برداشت کا نمونہ ظاہر کریں اور اپنے اخلاق دکھائیں۔ یقیناً یاد رکھو کہ عقل اور جوش میں خطرناک دشمنی ہے۔ جب جوش اور غصہ آتا ہے تو عقل قائم نہیں رہ سکتی۔ لیکن جو صبر کرتا ہے اور بردباری کا نمونہ دکھاتا ہے اس کو ایک نور دیا جاتا ہے جس سے اس کی عقل و فکر کی قوتوں میں ایک نئی روشنی پیدا ہو جاتی ہے اور پھر نور سے نور پیدا ہوتا ہے۔ غصّہ اور جوش کی حالت میں چونکہ دل و دماغ تاریک ہوتے ہیں اس لیے پھر تاریکی سے تاریکی پیدا ہوتی ہے۔

مَیں پھر اصل مطلب کی طرف رجوع کر کے کہتا ہوں کہ اسلام کی جو حالت اس وقت ہو رہی ہے اور یہ مختلف فرقہ بندیاں جو آئے دن ہوتی رہتی ہیں اور مخالف اس پر دلیر ہو رہے ہیں اور بیباکی سے حملے اور اعتراض کرتے ہیں یہ سب اسی دابۃُ الارض کا فساد ہے۔ انہوں نے ہی عیسائیوں کو مدد دی ہے۔ مگر اب خدا کا شکر کرو کہ اس نے عین وقت پر دستگیری فرمائی ہے اور اس سلسلہ کو قائم کیا ہے۔ اس لیے تم کو مناسب ہے کہ اس فضل کو جو تم کو دیا گیا ہے ضائع نہ کرو اور ادب کی نگاہ سے دیکھو اور اس مدد اور نصرت کی جو تمہیں دی گئی ہے قدر کرو۔ یقیناً یاد رکھو کہ خدا کی مدد بدُوں اور اس کے بلائے بغیر کوئی شخص راستی سے اور پوری قوّت سے ایک امر کو بیان نہیں کر سکتا۔ بغیر اس کے دلائل ملتے ہی نہیں اور طرز بیان نہیں دیا جاتا اور یہ بھی خدا کا خاص فضل ہوتا ہے کہ اس طرز بیان سے نیکی کی قوت رکھنے والے اس شخص کو جو خدا کی قوت اور طاقت پا کر روح القدس سے بھر کر بولتا ہے شناخت کر لیتے ہیں۔ پس تم پر یہ خدا تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے تمہیں یہ قوت عطا کی اور شناخت کی آنکھ دی۔ اگر وہ یہ فضل نہ کرتا تو جیسے اور لوگ پردوں میں ہیں اور گالیاں دیتے ہیں تم بھی ان میں ہی ہوتے۔ جس چیز نے تم کو کھینچا ہے وہ محض خدا کا فضل ہے۔"

(ملفوظات جلد سوم صفحہ 180-181)

## سامعین! آنحضرت کے اخلاق فاضلہ اور ان کا رنگ اپنے اندر پیدا کرنے کی نصیحت

فرماتے ہیں:

"مَیں نے پہلے بھی کہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جس قدر اخلاق ثابت ہوئے ہیں وہ کسی اَور نبی کے نہیں۔ کیونکہ اخلاق کے اظہار کے لئے جبتک موقع نہ ملے کوئی اخلاق ثابت نہیں ہو سکتا۔ مثلاً سخاوت ہے لیکن اگر روپیہ نہ ہو تو اس کا ظہور کیونکر ہو۔ ایسا ہی کسی کو لڑائی کا موقع نہ ملے تو شجاعت کیونکر ثابت ہو۔ ایسا ہی عفو، اس صفت کو وہ ظاہر کر سکتا ہے جسے اقتدار حاصل ہو۔ غرض سب خُلق موقع سے وابستہ ہیں۔ اب سمجھنا چاہئے کہ یہ کس قدر خدا کے فضل کی بات ہے کہ آپ کو تمام اخلاق کے اظہار کے موقعے ملے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو وہ موقعے نہیں ملے۔ مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سخاوت کا موقع ملا۔ آپؐ کے پاس ایک موقع پر بہت سی بھیڑ بکریاں تھیں۔ ایک کافر نے کہا کہ آپ کے پاس اس قدر بھیڑ بکری جمع ہیں کہ قیصر و کسریٰ کے پاس بھی اس قدر نہیں۔ آپؐ نے سب کی سب اس کو بخش دیں۔ وہ اسی وقت ایمان لے آیا کہ نبی کے سوا اور کوئی اس قسم کی عظیم الشان سخاوت نہیں کر سکتا۔ مکہ میں جن لوگوں نے دُکھ دیئے تھے۔ جب آپؐ نے مکہ کو فتح کیا تو آپؐ

چاہتے تو سب کو ذبح کر دیتے۔ مگر آپؐ نے رحم کیا اور لَاتَثْرِیْبَ عَلَیْکُم الْیَومَ کہہ دیا۔ آپؐ کا بخشنا تھا کہ سب مسلمان ہو گئے۔ اب اس قسم کے عظیم الشان اخلاقِ فاضلہ کیا کسی نبی میں پائے جاتے ہیں۔ ہر گز نہیں۔ وہ لوگ جنہوں نے آپؐ کی ذاتِ خاص اور عزیزوں اور صحابہ کو سخت تکلیفیں دی تھیں اور نا قابلِ عفو ایذائیں پہنچائی تھیں۔ آپؐ نے سزا دینے کی قوت اور اقتدار کو پا کر فی الفور ان کو بخش دیا۔ حالانکہ اگر ان کو سزا دی جاتی تو یہ بالکل انصاف اور عدل تھا۔ مگر آپؐ نے اس وقت اپنے عفو اور کرم کا نمونہ دکھایا۔ یہ وہ امور تھے کہ علاوہ معجزات کے صحابہ پر موثر ہوئے تھے۔ اس لئے آپؐ اسم با مسمّٰی محمدؐ ہو گئے تھے۔ صلی اللہ علیہ وسلم اور زمین پر آپؐ کی حمد ہوتی تھی اور اسی طرح آسمان پر بھی آپؐ کی تعریف ہوتی تھی اور آسمان پر بھی آپ محمدؐ تھے۔ یہ نام آپؐ کا اللہ تعالیٰ نے بطور نمونہ کے دنیا کو دیا ہے۔ جب تک انسان اس قسم کے اخلاق اپنے اندر پیدا نہیں کرتا۔ کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کی محبت کامل طور پر انسان اپنے اندر پیدا نہیں کر سکتا جب تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق اور طرزِ عمل کو اپنا رہبر اور ہادی نہ بناوے۔ چنانچہ خود اللہ تعالیٰ نے اس کی بابت فرمایا ہے۔ قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ یعنی محبوب الٰہی بننے کے لئے ضروری ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی جاوے سچی اتباع آپؐ کے اخلاق فاضلہ کا رنگ اپنے اندر پیدا کرنا ہوتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ آج کل لوگوں نے اتباع سے مراد صرف رفع یدین، آمین بالجہر اور رفع سبابہ ہی لے لیا ہے۔ باقی امور کو جو اخلاق فاضلہ آپؐ کے تھے، اُن کو چھوڑ دیا۔ یہ منافق کا کام ہے کہ آسان اور چھوٹے امور کو بجالاتا ہے اور مشکل کو چھوڑتا ہے۔ سچے مومن اور مخلص مسلمان کی ترقیوں اور ایمانی درجوں کا آخری نقطہ تو یہی ہے کہ وہ سچّا متّبع ہو اور آپؐ کے تمام اخلاق کو حاصل کرے جو سچائی کو قبول نہیں کرتا۔ وہ اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے۔ کروڑوں مسلمان دنیا میں موجود ہیں اور مسجدیں بھی بھری ہوئی نظر آتی ہیں مگر کوئی برکت اور ظہور ان مسجدوں کے بھرے ہوئے ہونے سے نظر نہیں آتا۔ اس لئے کہ یہ سب کچھ جو کیا جاتا ہے محض رسوم اور عادات کے طور پر کیا جاتا ہے۔ وہ سچّا اخلاص اور وفا جو ایمان کے حقیقی لوازم ہیں۔ ان کے ساتھ پائے نہیں جاتے۔ سب عمل ریاکاری اور نفاق کے پردوں کے اندر مخفی ہو گئے ہیں۔

جوں جوں انسان ان کے حالات سے واقف ہوتا جاتا ہے۔ اندر سے گند اور خُبث نکلتا آتا ہے۔ مسجد سے نکل کر گھر کی تفتیش کرو تو یہ ننگِ اسلام نظر آئیں گے۔ مثنوی میں ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک کوٹھا ہزار مَن گندم سے بھرا ہوا خالی ہو گیا۔ اگر چُوہے اس کو نہیں کھا گئے تو وہ کہاں گیا۔ پس اسی طرح پر پچاس برس کی نمازوں کی جب برکت نہیں ہوئی۔ اگر ریا اور نفاق نے ان کو باطل اور حبط نہیں کیا تو وہ کہاں گئیں۔ خدا کے نیک بندوں کے آثار ان میں پائے نہیں جاتے۔ ایک طبیب جب کسی مریض کا علاج کرتا ہے۔ اگر وہ نسخہ اس کے لئے مفید اور کارگر نہ ہو تو چند روز کے تجربہ کے بعد اس کو بدل دیتا ہے اور پھر تشخیص کرتا ہے۔ لیکن ان مریضوں پر تو وہ نسخہ استعمال کیا گیا ہے تو ہمیشہ مفید اور زُود اثر ثابت ہوا ہے۔ تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے نسخہ کے استعمال میں غلطی اور بد پرہیزی کی ہے۔ یہ تو ہم کہہ نہیں سکتے کہ ارکان اسلام میں غلطی تھی اور نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ موثر علاج نہ تھا۔ کیونکہ اس نسخہ نے ان مریضوں کو اچھا کیا جن کی نسبت لا علاج ہونے کا فتویٰ دیا گیا تھا۔ مَیں جانتا ہوں کہ جن لوگوں نے ان ارکان کو چھوڑ کر اور بدعتیں تراشی ہیں۔ یہ اُن کی اپنی شامتِ اعمال ہے ورنہ قرآنِ شریف تو کہہ چکا تھا۔ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُم دِینَکُم۔ اکمالِ دین ہو چکا تھا اور اتمامِ نعمت بھی خدا کے حضور پسندیدہ اسلام ٹھہر چکا تھا۔ اب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمالِ خیر کی راہ چھوڑ کر اپنے طریقے ایجاد کرنا اور قرآن شریف کی بجائے اور وظائف اور کافیاں پڑھنا یا اعمالِ صالحہ کے بجائے قسم قسم کے ذکر اذکار نکال لینا یہ لذت روح کیلئے نہیں ہے بلکہ لذتِ نفس کی خاطر ہے۔ لوگوں نے لذتِ نفس اور لذتِ روح میں فرق نہیں کیا اور دونوں کو ایک ہی چیز قرار دیا ہے۔ حالانکہ وہ دو مختلف چیزیں ہیں۔ اگر لذتِ نفس اور لذتِ روح ایک ہی چیز ہے تو مَیں پوچھتا ہوں کہ ایک بدکار عورت کے گانے سے بدمعاشوں کو زیادہ لذت آتی ہے کیا وہ اس لذتِ نفس کی وجہ سے عارف باللہ اور کامل انسان مانے جائیں گے۔ ہر گز نہیں۔ جن لوگوں نے خلافِ شرح اور خلافِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم راہیں نکالی ہیں ان کو یہی دھوکہ لگا ہے کہ وہ نفسِ روح کی لذت میں کوئی فرق نہیں کر سکتے ورنہ وہ ان بے ہودگیوں میں روح کی لذت اور اطمینان نہ پاتے۔ ان میں نفسِ مطمئنہ نہیں ہے جو بُلھے شاہ کی کافیہ میں لذت کے جویاں ہیں۔ رُوح کی لذت قرآن شریف سے آتی ہے"

(ملفوظات جلد 3 صفحہ 86-89)